© rasailojaraid.com

ہم تیری ہی عبادت[1] کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں
ہمیں سیدھا راستہ[2] دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام[3] فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں[4]۔

البقرہ

اس سورۃ کا نام "بقرہ" اس لیے ہے کہ اس میں ایک جگہ گائے کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید کی ہر سورۃ میں اس قدر وسیع مضامین بیان ہوئے ہیں کہ ان کے لیے مضمون کے لحاظ سے جامع عنوانات تجویز نہیں کیے جا سکتے۔ عربی زبان اگرچہ اپنی لغت کے اعتبار سے نہایت مالدار ہے، مگر بہر حال ہے تو انسانی زبان ہی۔ انسان جو زبانیں بھی بولتا ہے وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ وہ ایسے الفاظ یا فقرے فراہم نہیں کر سکتیں جو ان وسیع مضامین کے لیے جامع عنوان بن سکتے

---

[1] عبادت = بندگی، غلامی، اطاعت، پرستش، گرویدگی۔

[2] سیدھے راستے سے مراد دنیوی زندگی کے ہر شعبہ میں خیال و عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ ہے جو بالکل صحیح ہو، جس پر چل کر انسان براہ راست اپنی فلاح و سعادت کی انتہائی منزل تک پہنچ جائے جس میں غلط بینی اور غلط کاری کا خطرہ نہ ہو۔

[3] انعام سے مراد درحقیقت مال و دولت اور دنیوی جاہ و عزت کی بخشش نہیں ہے، بلکہ اللہ کی رضا اور اس کی بارگاہ میں مقبولیت، اور اس کی میزان میں قدر کا مستحق قرار پانا ہے۔ رہیں دنیوی نعمتیں، تو وہ اگر اللہ کے قانون شرعی کی اطاعت کرتے ہوئے حاصل ہوں تو ان پر بھی انعام کا اطلاق ہوگا، ورنہ وہ ابتلا اور استدراج کے قبیل کی چیزیں ہیں۔ آگے چل کر قرآن میں اس حقیقت کو پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے۔

[4] معتوب شخص اور بھٹکے ہوئے شخص میں فرق یہ ہے کہ بھٹکا ہوا وہ ہے جس پر سیدھا راستہ واضح ہی نہ ہوا ہو اس لیے وہ غلط راستوں میں بھٹکتا پھر رہا ہو، اور معتوب وہ ہے جس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو مگر وہ اپنی شرارتِ نفس کی وجہ سے قصداً اسے چھوڑ کر غلط راستہ پر چلے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے قرآن کی بیشتر سورتوں کے لیے عنوانات کے بجائے نام تجویز فرمائے جو محض علامت کا کام دیتے ہیں۔ اس سورۃ کو بقرہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں گائے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ "وہ سورۃ جس میں گائے کا ذکر ہے"۔

اس سورۃ کا بیشتر حصہ ہجرت مدینہ کے بعد مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے۔ اور کمتر حصہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبت مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کردیا گیا۔ حتیٰ کہ سود کی ممانعت کے سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانہ میں اتری تھیں۔ سورۃ کا خاتمہ جن آیات پر ہوا ہے وہ ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھیں مگر مضمون کی مناسبت سے ان کو بھی اسی سورۃ میں ضم کردیا گیا ہے۔

اس سورۃ کو سمجھنے کے لیے پہلے اس کا تاریخی پس منظر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:۔

(۱) ہجرت سے قبل جب تک مکہ میں اسلام کی دعوت دی جاتی رہی خطاب بیشتر مشرکین عرب سے تھا جن کے لیے اسلام کی آواز ایک نئی اور غیر مانوس آواز تھی۔ اب ہجرت کے بعد سابقہ یہودیوں سے پیش آیا جن کی بستیاں مدینہ سے بالکل متصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اُس ضابطہ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے ان کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور اصولاً اُن کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اُن کو اصل دین سے بہت دُور ہٹا دیا تھا۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہوگئی تھی جن کے لیے توراۃ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رسوم اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طریقے رواج پاگئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے توراۃ میں کوئی ثبوت نہ تھا خود توراۃ میں انھوں نے خدا کے کلام کے ساتھ انسانی کلام کو خلط ملط کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک اس میں لفظاً یا معنیً محفوظ تھا اس کو بھی انھوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی روح ان میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علماء اور مشائخ، ان کے سرداران قوم اور ان کے عوام، سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی۔ اور اپنے اس بگاڑ سے ان کو ایسی محبت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انھیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، موشگافیوں اور فرقہ بندیوں، استخواں گیری و مغز فگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام (مسلم) تک بھول گئے تھے، محض یہودی بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انھوں نے محض نسل اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا۔ پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اصل دین کی طرف دعوت دیں چنانچہ سورۂ بقرہ کے ابتدائی پندرہ سولہ رکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں۔ ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اخلاقی و مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے، اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خصوصیات کے مقابلہ میں حقیقی دین کے اصول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی امت کے بگاڑ کی نوعیت کیا ہوتی ہے، رسمی دینداری کے مقابلہ میں حقیقی دینداری کس چیز کا نام ہے، دین حق کے بنیادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصول کیا ہیں اور خدا کی نگاہ میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے۔

(۲) مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ مکہ میں تو معاملہ صرف اصول دین کی تبلیغ اور دین قبول کرنے والوں کی اخلاقی تربیت تک محدود تھا، مگر جب ہجرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے متعلق بھی اصولی ہدایات دینی شروع کیں اور یہ بتایا کہ اسلام کی اساس پر یہ نیا نظام سیاسی کس طرح تعمیر کیا جائے۔ اس سورۃ کے آخری ۲۳ رکوع زیادہ تر انہی ہدایات پر مشتمل ہیں، جن میں سے اکثر ابتدا ہی میں بھیج دی گئی تھیں اور بعض متفرق طور پر حسب ضرورت بعد میں بھیجی جاتی رہیں۔

(۳) ہجرت کے بعد اسلام اور کفر کی کشمکش بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت خود کفر کے گھر میں دی جا رہی تھی اور متفرق قبائل میں سے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے وہ اپنی اپنی جگہ رہ کر ہی دین کی تبلیغ کرتے اور جواب میں مصائب اور مظالم کے تختۂ مشق بنتے تھے مگر ہجرت کے بعد جب یہ منتشر مسلمان مدینہ میں جمع ہو کر ایک جتھا بن گئے تو صورت حال یہ ہو گئی کہ ایک طرف ایک چھوٹی سی بستی تھی اور دوسری طرف تمام عرب اس جماعت اور اس تحریک کا استیصال کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ اب اس مٹھی بھر جماعت کی کامیابی کا ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا انحصار بھی اس بات پر تھا کہ اولاً وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے۔ ثانیاً وہ مخالفین کا برسر باطل ہونا اس طرح ثابت و مبرہن کر دے کہ کسی ذی عقل انسان کو اس میں شبہ نہ رہے۔ ثالثاً بے خان ومان ہونے اور تمام ملک کی عداوت و مزاحمت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے دوچار ہونے کی بنا پر فقر و فاقہ اور ہمہ وقت بے امنی و بے اطمینانی کی جو حالت ان پر طاری ہوگئی تھی اور جن خطرات میں وہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے، ان میں وہ ہراساں نہ ہوں، پورے صبر و ثبات کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے عزم میں ذرا تزلزل نہ آنے دیں۔ رابعاً وہ پوری دلیری کے ساتھ ہر اس مسلح مزاحمت کا مسلح مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں جو ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کسی طاقت کی طرف سے کی جائے، اور اس بات کی ذرا پروا نہ کریں کہ مخالفین کی تعداد اور ان کی مادی طاقت کتنی زیادہ ہے۔ خامساً ان میں اتنی ہمت پیدا کی جائے کہ اگر عرب کے لوگ اس نئے نظام کو جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، فہمائش سے قبول نہ کریں، تو انھیں جاہلیت کے فاسد نظامِ زندگی کو بزور مٹا دینے میں بھی تأمل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں ان پانچوں امور کے متعلق ابتدائی ہدایات دی ہیں، اور بعد میں یہ کشمکش جتنی جتنی بڑھتی گئی اسی کے مطابق زیادہ مفصل ہدایات بعد کی سورتوں میں نازل ہوتی رہیں۔

(۴) دعوتِ اسلامی کے اس مرحلہ میں ایک نیا عنصر بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا، اور یہ منافقین کا عنصر تھا۔ اگرچہ اس کے ابتدائی آثار مکہ کے آخری زمانہ میں بھی نمایاں ہونے لگے تھے، مگر وہ صرف اس حد تک تھے کہ کچھ لوگ اسلام کے برحق ہونے کے تو معترف ہو گئے تھے اور ایمان کا اقرار بھی کرتے تھے لیکن اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اس حق کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی، اپنے دنیوی تعلقات کا انقطاع، اور اُن مصائب و شدائد کا نزول بھی برداشت کر لیں جو اس مسلکِ حق کو قبول کرنے کے ساتھ ہی نازل ہونے شروع ہو جاتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر اس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قسموں کے منافق بھی اسلامی جماعت میں پائے جانے لگے۔ ایک قسم کے منافق وہ تھے جو قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض فتنہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برپا کرنے کے لیے جماعت مسلمین میں داخل ہو جاتے تھے۔ دوسری قسم کے منافق وہ تھے جو اس جماعت کے دائرہ اقتدار میں گھر جانے کی وجہ سے اپنا مفاد اسی میں دیکھتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں میں بھی اپنا شمار کرائیں اور دوسری طرف مخالفین اسلام سے بھی ربط رکھیں تاکہ دونوں طرف کے فوائد سے متمتع ہوں اور دونوں طرف کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان متردد تھے، انھیں اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نہ تھا، مگر چونکہ ان کے قبیلہ، یا خاندان کے بیشتر لوگ مسلمان ہو چکے تھے اس لیے یہ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ شامل تھے جو امر حق ہونے کی حیثیت سے تو اسلام کے قائل ہو چکے تھے مگر جاہلیت کے طریقے چھوڑنے اور اخلاقی پابندیاں قبول کرنے اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بار اٹھانے سے ان کا نفس انکار کرتا تھا۔ سورۂ بقرہ کے نزول کے وقت ان منافقین کے ظہور کی محض ابتدا تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف صرف اجمالی اشارات فرمائے ہیں، بعد میں جتنی جتنی ان کی صفات اور حرکات نمایاں ہوتی گئیں اسی قدر تفصیل کے ساتھ بعد کی سورتوں میں ہر قسم کے منافقین کے متعلق ان کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ ہدایات بھیجی گئیں۔

اللہ کے نام سے، جو رحمان و رحیم ہے

الف، لام، میم۔[1] یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں[2]۔

---

[1] یہ حروف مقطعات قرآن کی بعض سورتوں کے آغاز میں لائے گئے ہیں۔ یہ جس سورۃ کی ابتدا میں پائے جاتے ہیں اس کے لیے نام یا علامت کا فائدہ بھی دیتے ہیں، افتتاح کلام کے لیے اصل بات شروع کرنے سے پہلے خطیب کی طرف سامعین کی توجہ کھینچنے کا کام بھی ان سے لیا گیا ہے، اور ان میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ یہ کلام اگرچہ انہی حروف و الفاظ سے مرکب ہے جو تمھاری زبان میں مستعمل ہیں مگر پھر بھی تم اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہو، اسی لیے جن جن سورتوں کے آغاز میں یہ حروف آئے ہیں ان سب میں قرآن کے اعجاز اور اس کے دلیل نبوت ہونے کا دعوی موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اس طرز بیان سے نامانوس نہ تھے کیونکہ انھوں نے

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ ہو)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہدایت ہے متقی لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لائیں، نماز قائم کریں، جو رزق ہم نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) قرآن کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود کبھی حروف مقطعات کے استعمال پر اعتراض تو درکنار کسی شبہ تک کا اظہار نہ کیا۔

۳ اس کا ایک سیدھا سادہ مطلب تو یہ ہے کہ "بیشک یہ اللہ کی کتاب ہے"۔ مگر ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دنیا میں جتنی کتابیں امور مابعد الطبیعت اور حقائق ماورائے ادراک سے بحث کرتی ہیں وہ سب قیاس و گمان پر مبنی ہیں، اس لیے خود ان کے مصنف بھی اپنے بیانات کے بارے میں شک سے پاک نہیں ہو سکتے خواہ وہ کتنے ہی یقین کا اظہار کریں۔ لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو سراسر علم حقیقت پر مبنی ہے، اس کا مصنف وہ ہے جو تمام حقیقتوں کا علم رکھتا ہے اس لیے فی الواقع اس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنی نادانی کی بنا پر اس کے بیانات میں شک کریں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۴ مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب سراسر رہنمائی ہے، مگر دنیا میں زندگی بسر کرنے کا جو راستہ یہ بتاتی ہے اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہی اس پر چل سکتے ہیں، بلکہ وہی لوگ اس راستہ کو دیکھ سکتے اور اس کی صحیح قدر جان سکتے ہیں جن میں یہ صفات پائی جائیں۔

۵ متقی = لغوی معنی: "اپنا بچاؤ کرنے والا"۔ اصطلاحی معنی: "وہ جو خدا کی ناراضی سے ڈرتا ہو، اُن برائیوں سے بچنا چاہتا ہو جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں، اور ان بھلائیوں پر عمل کرنے کا خواہشمند ہو جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں"۔ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ اولین شرط ہے۔ جو شخص خدا سے بے خوف ہو، جسے بھلے اور بُرے کی تمیز سے کوئی دلچسپی، برائی سے بچنے کی کوئی فکر، بھلائی کے طریقہ کی کوئی جستجو نہ ہو، اور جو اخلاقی قیود سے آزاد رہ کر بالکل جانوروں کی سی زندگی بسر کرنا چاہتا ہو اس کے لیے قرآن میں کوئی ہدایت نہیں۔

۶ غیب سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جو انسان کے علم و ادراک سے ماوراء ہیں، مثلاً خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، وحی، آخرت۔ ان حقیقتوں کو نبی کے اعتماد پر تسلیم کر لینے کا نام ایمان بالغیب ہے، یعنی "بے دیکھی چیز کو ماننا"۔ جو شخص محسوسات سے ماوراء کسی حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہ ہو اس کا نقطۂ نظر لامحالہ مادہ پرستانہ ہوگا۔ اس کے لیے ایک قدم بھی اس راستہ پر چلنا محال ہے جو قرآن پیش کرتا ہے، کیونکہ اس راستہ کا تو سارا دارومدار ہی اللہ کے اقتدار اعلیٰ (باقی صفحہ ۲۴ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کریں[۱]، جو ہدایت تم پر[۲] نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی اس کو قبول کریں[۳]، اور آخرت پر یقین رکھیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے صحیح روّیہ پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

جو لوگ ان باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں، ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم انھیں خبردا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) اور اس کی ہدایت بذریعۂ وحی اور آخرت کی باز پرس کو ماننے پر ہے۔

سلا اقامتِ صلوٰۃ یا نماز قائم کرنا ایک جامع اصطلاح ہے جس میں نہ صرف انفرادی حیثیت سے تمام شرائط و قواعد کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا اور ہمیشہ ادا کرتے رہنا، بلکہ اجتماعی حیثیت سے نماز کا باقاعدہ نظام قائم کرنا بھی شامل ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے لیے یہ بھی ناگزیر شرط ہے، کیونکہ جو شخص اس راستہ پر عملاً چلنے کے لیے تیار نہ ہو، اس کا محض راستہ کا جان لینا اور مان لینا نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ اور اس راستہ پر عملاً چلنے کے لیے جو چیز آدمی کو تیار کرتی، اور اس کی استعدادِ عمل کو پرورش کرتی ہے وہ نماز ہی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی وہ تنگ دل نہ ہوں، زر پرست نہ ہوں، ان کے مال میں خدا اور بندوں کے جو حقوق مقرر کیے جائیں انھیں ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، جس چیز پر ایمان لاتے ہیں اس کی خاطر مالی قربانی کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔

سلہ تم کا خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

سلہ یہ ایک عام غلطی ہے کہ اسلام کی تاریخ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کی جاتی ہے اور آنحضرت کو اس حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ گویا آپ ہی سے اسلام کا آغاز ہوا۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پچھلے انبیاؑ اور ان کی کتابوں پر ایمان لانا محض رواداری کے قبیل کی ایک چیز ہے۔ حالانکہ دراصل ابتدائے آفرینش سے جتنے بھی انبیاؑ آئے ہیں، ان کا دین یہی اسلام تھا، اور جتنی کتابیں اللہ کی طرف سے آئیں ان سب کی وہی ایک تعلیم تھی جو قرآن میں دی گئی ہے۔ قرآن اور نبوتِ محمدی اس سلسلہ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اسلام قبول کرے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ انبیاء اور کتبِ الٰہی کے پورے سلسلہ سے اپنا تعلق جوڑے، نہ کہ اس کی ایک کڑی سے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرو یا نہ کرو بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مُہر لگا دی ہے؀۱، ان کی آنکھوں پر پردہ پڑگیا ہے، اور وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اپنی دانست میں اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں، حالانکہ فی الواقع وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں؀۲ مگر نہیں سمجھتے۔ اُن کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا؀۳، اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کو دردناک سزا مِلنے والی ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انھوں نے

؀۱ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے مہر لگا دی تھی اس لیے انھوں نے تسلیم کرنے سے انکار کیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے ان بنیادی امور کو رُد کر دیا جن کا ذکرا وپر کیا گیا ہے، اور اپنے لیے قرآن کے پیش کردہ راستہ کے خلاف دوسرا راستہ پسند کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی۔ اس مہر لگنے کی کیفیت کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوگا جسے کبھی تبلیغ کا اتفاق ہوا ہو جب کوئی شخص آپ کے پیش کردہ طریقہ کو جانچنے کے بعد ایک دفعہ رد کر دیتا ہے تو اس کا ذہن اس طرح بالکل اُلٹی رفتار پر چل پڑتا ہے کہ آپ کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، آپ کی دعوت کے لیے اس کے کان بہرے، اور آپ کے طریقہ کی خوبیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، اور صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ فی الواقع اس کے دل پر مہر لگی ہوئی ہے۔

؀۲ یعنی وہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ روش ان کے لیے مفید ہوگی، حالانکہ دراصل یہ ان کو دنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی۔

؀۳ بیماری سے مراد منافقت کی بیماری ہے۔ اور اللہ کے اس بیماری میں اضافہ کرنے کی کیفیت یہ ہے کہ اس منافقانہ روش کی سزا وہ انھیں فوراً نہیں دیتا بلکہ انھیں ڈھیل دیتا ہے اور اس ڈھیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی منافقانہ چالوں کو بظاہر کامیاب ہوتے دیکھ کر وہ اور زیادہ مکمل منافق بنتے چلے جاتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں — خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد[۱] ہیں مگر انھیں شعور نہیں ہے۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ[۲] تو انھوں نے یہی جواب دیا کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں[۳]؟ — خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں، اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں[۴] سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں — اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے، وہ ان کی رسی دراز کیے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی، مگر یہ سودا بھی ان کے لیے نفع بخش نہ ہوا[۵]، اور یہ ہدایت قبول کرنے والے تو تھے ہی

---

[۱] لگائی بجھائی، سازشیں کرنا، ہر فریق کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا، طرفین کو اپنی مدد کا جھوٹا یقین دلانا اور وقت پر کسی کے ساتھ دغا کرنا، اپنی اغراض کے لیے حق و صداقت کا راستہ روکنا، یہ منافق کا شیوہ ہے اور اس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے نہ کہ اصلاح ہوتی ہے۔ مگر منافق ہمیشہ اپنے آپ کو مصلح ہی کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

[۲] یعنی جس طرح دوسرے مسلمان دیانت اور راستی کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں اسی طرح تم بھی اگر اسلام قبول کرتے ہو تو ایمانداری کے ساتھ سچے دل سے قبول کرو۔

[۳] وہ اپنے نزدیک ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں اور مشقتوں اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق اور راستی کی خاطر تمام ملک کی دشمنی مول لے لی جائے۔ ان کے خیال میں عقلمندی یہ تھی کہ آدمی حق اور باطل کی بحث میں نہ پڑے بلکہ ہر معاملہ میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے۔

[۴] شیطان کے معنی سرکش، متمرد، شوریدہ سر کے ہیں۔ انسان اور جن دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطین جن کے لیے آیا ہے، لیکن بعض مقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں - ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب سارا ماحول روشن ہو گیا تو اللہ نے اِن کا نورِ بصارت سلب کر لیا اور اِنھیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں اِنھیں کچھ نظر نہیں آتا[1] - یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں[2]، یہ اب نہ پلٹیں گے - یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے - یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں اور حال یہ ہے کہ اللہ نے ان منکرینِ حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے - بجلی کی چمک سے ان کی یہ حالت ہے

(بقیہ صفحہ ۲۶) مراد ہیں اور کہاں جن - اِس مقام پر شیاطین کا لفظ ان بڑے بڑے سرداروں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اُس وقت اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے -

[۱۵] اس سارے معاملہ کو تجارت سے تعبیر کرنے میں ایک لطیف تعریض ہے - دراصل وہ یہ سب کچھ کاروباری ذہنیت ہی کے ساتھ کر رہے تھے - ان کے ذہن سوداگری سے بالاتر کسی چیز کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے -

---

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] مطلب یہ ہے کہ جب ایک اللہ کے بندے نے روشنی پھیلائی اور حق کو باطل سے، صحیح کو غلط سے، راہِ راست کو گمراہیوں سے چھانٹ کر بالکل نمایاں کر دیا، تو جو لوگ دیدۂ بینا رکھتے تھے اُن پر تو ساری حقیقتیں روشن ہو گئیں، مگر یہ منافق جو نفس پرستی میں اندھے ہو رہے تھے ان کو اس روشنی میں کچھ نظر نہ آیا۔ "اللہ نے نورِ بصارت سلب کر لیا" کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کے تاریکی میں بھٹکنے کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے - اللہ نورِ بصارت اسی کا سلب کرتا ہے جو خود حق کا طالب نہیں ہوتا، خود ہدایت کے بجائے گمراہی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، خود صداقت کا روشن چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ جب اُنھوں نے نورِ حق سے منہ پھیر کر ظلماتِ باطل ہی میں بھٹکنا چاہا تو اللہ نے انھیں اسی کی توفیق عطا فرما دی -

[۲] حق بات سننے کے لیے بہرے، حق گوئی کے لیے گونگے، حق بینی کے لیے اندھے-

---

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ گویا عنقریب ان کی بصارت غائب ہو جائے گی جب ذرا کچھ روشنی انھیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں[۱]۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا[۲] کہ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

[۳] لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمھارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُن سب کا خالق ہے، تمھارے بچنے[۴] کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کی پیداوار

---

[۱] پہلی مثال ان منافقین کی تھی جو دل میں قطعی منکر تھے اور کسی غرض و مصلحت سے مسلمان بن گئے تھے۔ دوسری مثال ان کی ہے جو شک اور تذبذب اور ضعف ایمان میں مبتلا تھے، کچھ حق کے قائل بھی تھے مگر ایسی حق پرستی کے قائل نہ تھے کہ اس کی خاطر تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی برداشت کر جائیں۔ اس مثال میں بارش سے مراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا، اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک سے مراد مشکلات و مصائب کا وہ ہجوم اور وہ سخت مجاہدہ ہے جو تحریکِ اسلامی کے مقابلہ میں اہل جاہلیت کی شدید مزاحمت کے سبب سے پیش آرہا تھا۔ مثال کے آخری حصہ میں ان کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو یہ چل پڑتے ہیں اور جب مشکلات کے دل بادل چھانے لگتے ہیں، یا ایسے احکام دیے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کے تعصباتِ جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

[۲] یعنی جس طرح پہلی قسم کے منافقین کا نورِ بصارت اس نے بالکل سلب کر لیا، اسی طرح اللہ اِن کو بھی حق کے لیے اندھا بہرا بنا سکتا تھا، مگر اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ جو کسی حد تک دیکھنا اور سننا چاہتا ہو اسے اتنا بھی نہ دیکھنے سننے دے جس قدر حق دیکھنے اور حق سننے کے لیے یہ تیار تھے اسی قدر سماعت و بصارت اللہ نے ان کے پاس رہنے دی۔

[۳] اگرچہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام ہے، مگر اس دعوت سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا لوگوں کی اپنی آمادگی اور اس آمادگی کے مطابق اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہٰذا پہلے انسانوں کے درمیان فرق کرکے واضح کر دیا گیا کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور کس قسم کے نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے بعد اب تمام نوعِ انسانی کے سامنے وہ چیز پیش کی جاتی ہے جس کی طرف بلانے کے لیے قرآن آیا ہے۔

[۴] بچنے سے مراد دنیا میں غلط بینی و غلط کاری سے اور آخرت میں خدا کے عذاب سے محفوظ رہنا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکال کر تمھارے لیے رزق بہم پہنچایا، پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھیراؤ۔ ۲۱ اور اگر تمھیں اس امر میں شک ہے کہ جو کتاب ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے وہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ ۲۲ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر، ۲۳ جو مہیّا کی گئی ہے منکرینِ حق کے لیے۔ اور اے پیغمبر، جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں انھیں خوشخبری دیدو کہ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے دریا بہتے ہوں گے۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے، جب کوئی پھل انھیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے۔ ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہونگی، اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز

---

۲۱ یعنی جب تم خود بھی اس بات کے قائل ہو اور تمھیں معلوم ہے کہ یہ سب تخلیق و تدبیر اللہ ہی کی ہے تو تمھاری بندگی اسی کے لیے خاص ہونی چاہیے، دوسرا کون اس کا حق دار ہو سکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجا لاؤ؟ دوسروں کو اللہ کا مدمقابل ٹھیرانے سے مراد یہ ہے کہ بندگی کی مختلف انواع میں سے کسی نوع کا رویہ ان کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ آگے چل کر خود قرآن ہی سے تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ بندگی کی یہ انواع کون کون سی ہیں جنھیں اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔

۲۲ اس سے پہلے مکہ میں کئی بار یہ چیلنج دیا جا چکا تھا کہ اگر تم اس قرآن کو انسان کی تصنیف سمجھتے ہو تو اس کے مانند کوئی کلام تصنیف کر کے دکھاؤ۔ اب مدینہ پہنچ کر پھر اسی کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔

۲۳ اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہاں صرف تم ہی دوزخ کا ایندھن نہ ہو گے بلکہ تمھارے وہ بت بھی وہاں تمھارے ساتھ ہی موجود ہوں گے جنھیں تم نے اپنا معبود و مسجود بنا رکھا ہے۔ اس وقت تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ خدائی میں یہ کتنا دخل رکھتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تمثیلیں دیتے[1]۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں وہ انھیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے[2]۔ اور گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق[3] ہیں، جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں[4]، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنھیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، اور اس روش سے وہ خود ہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

تم اللہ کے ساتھ کفر و بغاوت کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندگی عطا کی، پھر وہی تمہاری جان سلب کرے گا، پھر وہی تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا، پھر اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں، پھر

---

[1] یہ ایک اعتراض کا جواب ہے جو مخالفین کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ قرآن میں متعدد مقامات پر توضیح مدعا کے لیے مکڑی، مکھی وغیرہ کی تمثیلیں دی گئی ہیں۔ اس پر ان لوگوں کا اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلام الٰہی ہے جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلیں ہیں۔

[2] یعنی جو لوگ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے، حقیقت کی جستجو ہی نہیں رکھتے ان کی نگاہیں تو بس ظاہری الفاظ میں اٹک کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان چیزوں سے اُلٹے نتائج نکال کر حق سے اور زیادہ دور چلے جاتے ہیں برعکس اس کے جو خود حقیقت کے طالب ہیں اور صحیح بصیرت رکھتے ہیں ان کو انہی باتوں میں حکمت کے جوہر نظر آتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی حکیمانہ باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہوسکتی ہیں۔

[3] فاسق = نافرمان، اطاعت کی حد سے نکل جانے والا۔

[4] بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام جو فرمان یا ہدایت جاری کرتا ہے اس کو عربی محاورہ میں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی تعمیل ان پر واجب ہوتی ہے۔ یہاں عہد کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے جس کی رو سے تمام نوعِ انسانی صرف اسی کی بندگی، اطاعت اور پرستش کرنے پر مامور ہے۔ "مضبوط باندھ لینے کے بعد" سے اشارہ اس طرف ہے کہ آدم کی تخلیق کے وقت تمام نوعِ انسانی سے اس فرمان کی پابندی کا اقرار لے لیا گیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان[۳۱] استوار کیے۔ اور وہ ہر چیز کا علم[۳۲] رکھنے والا ہے۔ ع ۳

پھر ذرا[۳۳] اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں[۳۴] سے کہا تھا کہ "میں زمین میں

---

[۳۱] سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے اس کا تعین مشکل ہے۔ انسان ہر زمانہ میں آسمان، یا بالفاظ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس مجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماورا جس قدر کائنات ہے اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔

[۳۲] اس فقرے میں دو اہم حقیقتوں پر متنبہ فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ تم اس خدا کے مقابلہ میں کفر و بغاوت کا رویہ اختیار کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہو جو تمہاری تمام حرکات سے باخبر ہے، جس سے تمہاری کوئی حرکت چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ دوسرے یہ کہ جو خدا تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جو درحقیقت علم کا سرچشمہ ہے اس سے منہ موڑ کر بجز اس کے کہ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکو اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جب اس کے سوا علم کا اور کوئی منبع ہی نہیں ہے، جب اس کے سوا اور کسی سے وہ روشنی نہیں مل سکتی جس میں تم اپنی زندگی کا راستہ صاف دیکھ سکو تو آخر اس سے روگردانی کرنے میں کیا فائدہ تم نے دیکھا ہے؟

[۳۳] اوپر کے رکوع میں بندگیٔ رب کی دعوت اس بنیاد پر دی گئی تھی کہ وہ تمہارا خالق ہے، پروردگار ہے، اُسی کے قبضۂ قدرت میں تمہاری زندگی و موت ہے، اور جس کائنات میں تم رہتے ہو اس کا مالک و مدبر وہی ہے، لہٰذا اس کی بندگی کے سوا تمہارے لیے اور کوئی دوسرا طریقہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اب اس رکوع میں وہی دعوت اس بنیاد پر دی جارہی ہے کہ اس دنیا میں تم کو خدا نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تمہارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس کی بندگی کرو بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کے اشاروں پر چلے تو بدترین بغاوت کے مجرم ہوگے اور بدترین انجام دیکھو گے۔

اس سلسلہ میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوع انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ اُن نتائج سے بہت زیادہ قیمتی ہیں جو زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک خلیفہ[۱] بنانے والا ہوں"۔ انھوں نے عرض کیا" کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا[۲]؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں[۳]"۔ فرمایا "میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے[۴]"۔ اس کے بعد اللہ نے

(بقیہ صفحہ ۳۱) اور انھیں قیاس و تخمین سے ربط دے کر آدمی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

[۵] ملک کے اصل معنی عربی میں "پیامبر" کے ہیں۔ اسی کا لفظی ترجمہ فرشتہ ہے۔ یہ محض مجرد قوتیں نہیں ہیں جو تشخص نہ رکھتی ہوں، بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں جن سے اللہ اپنی اس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ سلطنت الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ جاہل لوگ انھیں غلطی سے خدائی میں حصہ دار سمجھ بیٹھے اور بعض نے انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھا اور ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] خلیفہ۔ وہ جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشار کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشار کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقہ سے استعمال کرنے لگے، یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشار کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری و بغاوت کے افعال ہوں گے۔

[۲] یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا بلکہ استفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ خدا کی کسی تجویز پر اعتراض کریں۔ وہ "خلیفہ" کے لفظ سے یہ تو سمجھ گئے تھے کہ اس زیر تجویز مخلوق کو زمین میں کچھ اختیارات سپرد کیے جانے والے ہیں مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سلطنتِ کائنات کے اس نظام میں کسی با اختیار مخلوق کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے، اور اگر کسی کی طرف کچھ ذرا سے بھی اختیارات منتقل کر دیے جائیں تو سلطنت کے جس حصہ میں بھی ایسا کیا جائے گا وہاں کا انتظام خرابی سے کیسے بچ جائے گا۔ اسی بات کو وہ سمجھنا چاہتے تھے۔

[۳] اس فقرہ سے فرشتوں کا مدعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، ہم اس کے مستحق ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہے، آپ کے احکام بجا لانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں (باقی صفحہ ۳۳ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے[۴۱]، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا "اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔ انھوں نے عرض کیا "نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے[۴۲]۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں"۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا "تم انھیں ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔ جب اس نے ان کو سارے نام

(بقیہ صفحہ ۳۴۲) مرضی مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آپ کی حمد و ثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدام ادب کر رہے ہیں، اب کمی کس چیز کی ہے کہ اس کے لیے ایک خلیفہ کی ضرورت ہو؟ ہم اس کی مصلحت نہیں سمجھ سکے۔ (تسبیح کا لفظ ذو معنی ہے، اس کے معنی پاکی بیان کرنے کے بھی ہیں، اور سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ سعی کرنے کے بھی۔ اسی طرح تقدیس کے بھی دو معنی ہیں، ایک تقدس کا اظہار و بیان، دوسرے پاک کرنا)

۴۰ یہ فرشتوں کے دوسرے شبہ کا جواب ہے۔ یعنی فرمایا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مصلحت میں جانتا ہوں، تم اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ اپنی جن خدمات کا تم ذکر کر رہے ہو وہ کافی نہیں ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۴۱] انسان کے علم کی صورت در اصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعہ سے اشیاء کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے، لہٰذا انسان کی تمام معلومات در اصل اسماء اشیاء پر مشتمل ہیں۔ آدم کو سارے نام سکھانا گویا ان تمام اشیاء کا علم دینا تھا جن کے نام انھیں سکھائے گئے تھے۔

۴۲ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صنف کا علم صرف اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال دوسرے محکموں کے فرشتوں کا ہے۔ انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے۔ ایک ایک شعبہ کے متعلق چاہے وہ اس شعبہ کے فرشتوں سے کم جانتا ہو، مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے وہ فرشتوں کو میسر نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بتا دیے[۴۱] تو اللہ نے فرمایا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اُسے بھی میں جانتا ہوں"۔

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے[۴۲]، مگر ابلیس[۴۳] نے

---

[۴۱] یہ مظاہرہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے پہلے شبہ کو رفع فرما دیا۔ گویا اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا کہ میں اسے صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں بلکہ علم بھی دے رہا ہوں، اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تمھیں ہوا وہ اس معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو صلاح کا بھی ہے اور وہ اس سے زیادہ وزنی، زیادہ بیش قیمت ہے حکیم کا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کر دے۔

[۴۲] یعنی زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کے لیے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ اس علاقہ میں اللہ کے حکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا تھا، اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے اُن اختیارات کو استعمال کرنا چاہے جو ہم نے اُسے عطا کیے ہیں، اور ہم اپنی مشیت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں، تو تمھارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرۂ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنا، نیکی کرنا چاہے یا بدی، دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اُسکی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں، تمھیں اس کے لیے سازگاری کرنی ہو گی۔ مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھیے کہ ایک فرمانروا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی حصہ کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اس حصہ میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں، اور جب تک فرمانروا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے اس وقت تک اُس کا ساتھ دیتے رہیں قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام میں۔ البتہ جب جس کام کے بارے میں بھی فرماں روا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انھیں ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقہ کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے۔ حتیٰ کہ جس وقت فرمانروا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی معزولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو وہی ماتحت خدام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں (باقی صفحہ ۳۵ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انکار کیا، اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔ [۵۱]

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی، دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا [۵۳] ورنہ ظالموں [۵۴] میں شمار ہو گے۔ آخر کار شیطان نے ان دونوں کو

بقیہ صفحہ ۴۴) ہتھکڑیاں ڈال کر انھیں کشاں کشاں دارالفاسقین کی طرف لے جاتے ہیں۔ فرشتوں کو آدم کے لیے سربسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو، اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[۵۳] ابلیس ۔ لفظی ترجمہ "انتہائی مایوس"۔ اصطلاحاً یہ اس جن کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدم اور بنی آدم کے لیے مطیع و مسخر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اسے نسلِ انسانی کو بہکانے اور گمراہیوں کی طرف ترغیب دینے کا موقع دیا جائے۔ اسی کو شیطان بھی کہا جاتا ہے اور جہاں کوئی قرینہ ایسا نہ ہو کہ انسان مراد لیا جا سکے وہاں لفظ شیطان سے یہی ابلیس مراد ہوتا ہے۔ درحقیقت ابلیس بھی محض کسی مجرد قوت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک صاحب تشخص ہستی ہے جس طرح ہر انسان ایک صاحب تشخص ہستی ہوتا ہے۔ نیز کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ یہ فرشتوں میں سے تھا۔ آگے چل کر قرآن نے خود تصریح کر دی ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا جو فرشتوں سے الگ، مخلوقات کی ایک مستقل صنف ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] ان الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابلیس سجدے سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا بلکہ جنوں کی ایک جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو گئی تھی اور ابلیس کا نام صرف اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ ان کا سردار اور اس بغاوت میں پیش پیش تھا۔ لیکن اسی آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "وہ کافروں میں سے تھا"۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جنوں کی ایک جماعت پہلے سے ایسی موجود تھی جو سرکش و نافرمان تھی، اور ابلیس کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ قرآن میں بالعموم "شیاطین" کا لفظ انہی جنوں اور ان کی ذریت (نسل) کے لیے استعمال ہوا ہے، اور جہاں شیاطین سے مراد انسان مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہ ہو وہاں یہی مراد ہوتے ہیں۔

[۵۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین، یعنی اپنی جائے تقرر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے ان دونوں کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش (باقی صفحہ ۳۶ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ اب تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے

(بقیہ صفحہ ۴۵) ہو جائے۔ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے قریب نہ پھٹکنا، اور اس کا انجام بھی بتا دیا گیا کہ ایسا کرو گے تو ہماری نگاہ میں ظالم قرار پاؤ گے۔ یہ بحث غیر ضروری ہے کہ وہ درخت کونسا تھا اور اس میں کیا خاص بات تھی کہ اس سے منع کیا گیا۔ منع کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس درخت کی خاصیت میں کوئی خرابی تھی اور اس سے آدم و حوا کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اصل غرض اس چیز کی آزمائش تھی کہ یہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلہ میں کس حد تک حکم کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کسی ایک چیز کا منتخب کر لینا کافی تھا۔ اسی لیے اللہ نے درخت کے نام اور اس کی خاصیت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمھارے لیے تمھارے مرتبہ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلہ میں اگر تم اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے منحرف ہو جاؤ گے تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح آخر میں بھی محروم ہی رہو گے۔ اپنے اس مقام لائق کی، اپنی اس فردوس گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اس طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اُس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو جو تمھیں فرمانبرداری کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

۵۳ ظالم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ ظلم دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے، اولاً خدا کا حق کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے، ثانیاً ان تمام چیزوں کے حقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیاء جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے، مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھیرنا اور وہیں گذر بسر کرنا ہے۔ اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی ۵۱ جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا ۵۲ اور رحم کرنے والا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۶) استعمال کیے تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے، مگر نافرمانی کرکے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ انہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہ گار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۵۰ یعنی انسان کا دشمن شیطان، اور شیطان کا دشمن انسان۔ شیطان کا دشمن انسان ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے ہٹانے اور تباہی میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا انسان کا دشمن شیطان ہونا، تو فی الواقع انسانیت تو اس سے دشمنی ہی کی مقتضی ہے مگر خواہشات نفس کے لیے جو ترغیبات وہ پیش کرتا ہے ان سے دھوکا کھا کر آدمی اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ اس طرح کی دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حقیقتاً دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دشمن دوسرے دشمن سے شکست کھا گیا اور اس کے جال میں پھنس گیا۔

۵۱ یعنی آدم کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انھوں نے نافرمانی سے پھر فرماں برداری کی طرف رجوع کرنا چاہا، اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں تو انھیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دعا کر سکتے۔ اللہ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ بتا دیے۔

توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آگیا، طریق بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو گیا، پھر سے نظرِ عنایت اس کی طرف مائل ہو گئی۔

۵۲ قرآن اس نظریہ کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہر حال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ یہ انسان کے اپنے خود ساختہ گمراہ کن نظریات میں سے ایک بڑا گمراہ کن نظریہ ہے، کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گناہگارانہ زندگی میں مبتلا ہو گیا اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ (باقی صفحہ ۳۸ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اُتر جاؤ[1]، پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا اندیشہ

(بقیہ صفحہ ۲۷) ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آئندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی امید نہیں، جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہر حال تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمہیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس برائی پر تمہیں سزا ملتی ہے وہ بھی برائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مترتب ہی ہو کر رہے، بلکہ اللہ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے اور چاہے سزا دیدے۔ البتہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت، اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی، اور جس بھلائی کو رد کر دیتا ہے اسے اس بنا پر رد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی مگر اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکاب جرم کی خواہش موجود ہو، اور اپنی رحمت سے معافی اس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد بندہ اپنے کیے پر شرمندہ اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم، کٹے سے کٹے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی و نا امیدی کا کوئی موقع نہیں بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم، اور بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اس فقرہ کا دوبارہ اعادہ معنی خیز ہے۔ اوپر کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدم نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کرلی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم اپنی اس نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے، گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا، نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذاللہ خدا کو اپنا اکلوتا بھیج کر نوع انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھوانا پڑتا، برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ اس کے بعد (باقی حاشیہ صفحہ ۲۹ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ ہوگا، اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیاتؐ کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۵۲"۔ ع۴

(بقیہ صفحہ ۳۸) انھیں نبوت سے بھی سرفراز کیا تاکہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔ اب جو جنت سے نکلنے کا حکم پھر دہرایا گیا تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مقتضیٰ نہ تھا کہ آدم کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اتارا جاتا۔ زمین ان کے لیے دار العذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اتارے گئے، بلکہ انھیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنت ان کی اصلی جائے قیام نہ تھی۔ وہاں سے نکلنے کا حکم ان کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اصل تجویز تو ان کو زمین ہی پر اتارنے کی تھی، البتہ اس سے پہلے ان کو اُس امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا جس کا ذکر اوپر ایک حاشیہ میں کیا جا چکا ہے۔

حواشی صفحہ ہٰذا ۵۱ آیات جمع ہے آیت کی۔ آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔ کہیں آثارِ کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہرِ قدرت میں سے ہر چیز اُس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے۔ کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیا علیہم السلام لے کر آتے تھے، کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرماں روائے کائنات کے نمائندے ہیں۔ کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے اس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اس کے الفاظ اور اندازِ بیان اور طرزِ عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں ـــــ ہر جگہ عبارت کے سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں "آیت" کا لفظ کس معنی میں آیا ہے۔

۵۲ یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کے لیے اللہ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رکوع میں اللہ کے "عہد" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستہ کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے۔ اور اس راستہ کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کسی انسان کے پاس براہ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے یا پھر وہ اس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صورت یہ معلوم ہونے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ ان دو صورتوں کے ماسوا ہر صورت غلط ہے بلکہ غلط ہی نہیں عین بغاوت ہے جس کی سزا جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

© rasailojaraid.com